حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دار العلوم کراچی

یادیں

(سولہویں قسط)

شرافی گوٹھ میں دار العلوم کی تعمیر

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ علامہ عثمانیؒ کے مزار والی جگہ چھوڑنے کے بعد یہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص اور توکل کی برکت تھی کہ اس واقعے کو چند مہینے ہی گذرے تھے کہ ایک تاجر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے، اور انہوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست حاجی ابراہیم دادا بھائی جنوبی افریقہ میں مقیم ہیں۔ کراچی شہر سے کچھ دور ملیر کے عقب میں شرافی گوٹھ کے نام سے ایک گاؤں میں ان کی کچھ زمین ہے جس میں ایک بنگلہ اور سرونٹ کوارٹرز طرز کے کچھ مکانات بھی بنے ہوئے ہیں، اور ایک کنواں بھی ہے۔ وہ یہ زمین دار العلوم کو بطور عطیہ دینے کیلئے تیار ہیں، بشرطیکہ وہاں تعمیر پانچ سال کے اندر اندر کرنے کا وعدہ کیا جائے۔ حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے وہ جگہ جا کر دیکھی، تو وہ شہر سے کہیں دور تمام تر ریت کے ٹیلوں اور جھاڑیوں سے بھری ہوئی زمین تھی، اور اُس تک پہنچنے کا راستہ بھی انتہائی دشوار گذار تھا۔ وہاں جانے کیلئے کوئی پکی سڑک موجود نہیں تھی، کورنگی کریک جانے والی سڑک پر موجودہ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کا کوئی تصور نہیں تھا، چنانچہ کورنگی کریک روڈ پر کئی میل ویرانے میں چلنے کے بعد ایک جگہ پہنچ کر (تقریباً اس جگہ جہاں آج انڈسٹریل ایریا کی سڑک شروع ہوتی ہے) کچے میں نیچے اترنا پڑتا تھا، اور وہاں سے پانچ میل سے بھی زائد فاصلہ کچے میں اس طرح طے کرنا پڑتا تھا کہ ہچکولے کھاتی ہوئی گاڑی بیس میل سے زیادہ رفتار سے نہیں چل سکتی تھی۔ دوسری طرف بس سے آنے کا راستہ بھی بڑا دشوار گذار تھا، کیونکہ کورنگی ٹاؤن شپ کا اس وقت تصور تک نہیں تھا، اور لانڈھی کالونی اس وقت نئی نئی آباد ہونی شروع ہوئی تھی جس کے آخری

اسٹاپ سے اس جگہ کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ میل کا تھا جو تمام تر جھاڑیوں اور ٹیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور چلنے کے لئے کوئی مستقل کچی سڑک بھی نہیں تھی۔

سچی بات یہ ہے کہ اُس وقت اس زمین پر دارالعلوم تعمیر کرنے کا تصور بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اور یہ ان حضرات ہی کا حوصلہ تھا کہ اس ویرانے میں اس عظیم کام کا بیڑا اٹھالیا، اور حاجی ابراہیم دادا بھائی مرحوم نے مؤرخہ ۱۹/ جولائی ۱۹۵۵ء (تقریباً ۲۸/ ذوالقعدہ ۱۳۷۴ھ) کو اُس زمین میں سے پچیس ایکڑ زمین دارالعلوم کو دیدی۔ بعد میں چھ ایکڑ زمین کا اُس میں اضافہ کرکے ان کی طرف سے کل ۳۱ ایکڑ زمین بطور عطیہ دی گئی۔ (بعد میں جب اس علاقے کو ٹاؤن پلاننگ میں شامل کیا گیا، تو نقشہ درست کرنے کیلئے حکومت کو ان اکتیس ایکڑ میں سے کچھ زمین کی ضرورت پڑی، اور اس کے بدلے دارالعلوم کو غیر آباد زمین میں سے ۲۵ ایکڑ مزید زمین حکومت سے مل گئی جس کے نتیجے میں دارالعلوم کا کل رقبہ چھپن ایکڑ ہوگیا۔ لیکن ابتدا میں کام پچیس ایکڑ زمین کی بنیاد پر ہی شروع ہوا۔)

چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہ، حضرت مولانا نوراحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مجلس منتظمہ کے دوسرے ارکان نے توکلاً علی اللہ مؤرخہ ۳۰/ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ بروز جمعہ مطابق ۱۶/ دسمبر ۱۹۵۵ء اس نئی جگہ پر تعمیر کا آغاز کردیا۔(۱)

حاجی عبداللطیف صاحب باوانی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت کے ساتھ بڑی دین داری سے نوازا تھا۔ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے پاس دارالعلوم کو جو جگہ ملی تھی، اور جس کا تذکرہ میں پہلے کرچکا ہوں، اس زمین پر بھی اس وقت انہوں نے ۹۳ ہزار روپے تعمیر کے لئے دینے کا اعلان کیا تھا، لیکن وہاں مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر تعمیر نہ ہوسکی تھی۔ اب یہ نئی جگہ ملی، تو انہوں نے یہ ذمہ داری لے لی کہ وہ دارالعلوم کی دو عمارتوں کی تعمیر اپنے اور اپنے متعلقین کے ذریعے کرائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی یہ ذمہ داری ایسی نبھائی کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ وہ بکثرت دشوار گذار راستہ طے کرکے خود وہاں پہنچتے، اور خود کھڑے ہوکر تعمیری کام کی نگرانی کرتے تھے۔ حضرت مولانا

---

(۱) یہ تاریخ دارالعلوم کراچی کی روداد بابت رمضان ۱۳۷۳ھ تا شعبان ۱۳۷۴ھ مطابق مئی ۱۹۵۴ء تا اپریل ۱۹۵۵ء میں صفحہ ۸۷ پر درج ہے۔

نوراحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوتو اللہ تعالیٰ نے مہم جوئی کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ جو کام جتنا زیادہ مشکل ہو، اُسے وہ اتنے ہی جوش وخروش سے انجام دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عمارت جلد از جلد تعمیر کرنے کیلئے دن رات ایک کردیا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دس مہینے کی مختصر مدت میں عمارتوں کے دو بلاک آمنے سامنے تیار ہوگئے جن میں سے ایک بلاک طلبہ کی رہائش گاہ کا تھا، اور دوسرا درس گاہوں کا۔

دوسری طرف دور دراز کے صحرا میں دارالعلوم کی تعمیر کم ازکم اس معیار تک پہنچائی تھی کہ اگلے تعلیمی سال سے وہاں تعلیم شروع کی جاسکے۔ لیکن وہاں تعلیم شروع کرنے میں یہ زبردست دشواری پیش آگئی کہ دارالعلوم کے وہ اساتذۂ کرام جن پر نانک واڑہ میں تعلیم کا بڑی حدتک دارومدار تھا، وہ اگلے سال سے رخصت ہورہے تھے، کیونکہ اُسی سال حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ نیوٹاؤن کی جامع مسجد میں ایک نئے مدرسے کی بنیاد ڈال رہے تھے جو اب ماشاء اللہ ملک کے ممتاز ترین مدارس میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب، حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب اور حضرت مولانا بدیع الزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہم اُس مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دینے کا وعدہ کرچکے تھے، حضرت مولانا منتخب الحق صاحبؒ اور حضرت مولانا مظہر بقا صاحبؒ کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات سے وابستہ ہوگئے تھے۔ حضرت مولانا عبید الحق صاحبؒ ڈھاکہ جاچکے تھے۔ ان حضرات کی جگہ پُر کرنا آسان نہیں تھا۔ ادھر ابتک صحیح بخاری کا بڑا حصہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود پڑھاتے تھے، اور اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے جو شہر سے متعلق تھیں، اُن کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دارالعلوم کی نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد یہ درس جاری رکھ سکیں۔ اس لئے دارالعلوم کی نئی عمارت میں تعلیم شروع کرنے کے لئے نئے اساتذہ کی اچھی بڑی تعداد درکار تھی۔

دوسری طرف حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ کسی مدرسے میں مصروف کسی استاذ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دینا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے، اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرے مدرسے کو آباد کرنا درست نہیں، الا یہ کہ خود کوئی استاذ وہ مدرسہ چھوڑنا چاہتا ہو۔

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اس مشکل کا یہ حل نکلا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اطلاع ملی کہ بعض اساتذہ اپنے طور پر اپنے مدرسے چھوڑنا چاہتے ہیں، اس لئے انہیں دعوت دینے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحبؒ نے بہاول پور سے، حضرت مولانا مفتی رشید احمد

صاحبؒ نے ٹھیڑی سے، حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ نے مظاہر علوم سہارنپور سے اور حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم نے ٹنڈوالہ یار سے تشریف لانے کا وعدہ کرلیا۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ جو ابتک ادارۂ شرقیہ کے نام سے جیکب لائن میں السنۂ شرقیہ کے امتحانات کی تیاری کرایا کرتے تھے، انہوں نے بھی اعزازی طور پر کچھ اسباق پڑھانے کا وعدہ فرمالیا۔ نیز حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت نوجوان تھے، اور تازہ تازہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے فارغ ہوئے تھے، انہوں نے بھی دارالعلوم میں خدمات انجام دینے کا ارادہ فرمایا، اور اسی طرح ہمارے چچازاد بھائی حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ بھی اُنہی دنوں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بھی دیوبند سے بلالیا، اور اس طرح اساتذہ کی کمی بڑی حد تک پوری ہوگئی۔

شرافی گوٹھ میں منتقلی

ہم ابتک اپنے گھر میں رہکر ہی تعلیم حاصل کررہے تھے، اور روزانہ صبح کو مدرسے جاتے، اور شام کو گھر واپس آتے تھے۔ لیکن مدرسے کے نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد اب یہ نظم ممکن نہیں تھا، کیونکہ نئی عمارت گھر سے بہت دور تھی، اور وہاں تک پہنچنے کے لئے کئی گھنٹے صرف کرنے پڑتے تھے۔ لہٰذا وہاں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے ہمیں ہفتے بھر وہیں دارالاقامہ میں رہنا تھا۔ ابتک کبھی گھر سے دور رہنے کا موقع پیش نہیں آیا تھا، اور اپنا گھر بھی نیا نیا بنا تھا جس کی راحتوں سے صرف ایک سال ہی استفادہ کرپائے تھے۔ میری عمر کا چودھواں سال تھا، اور والدین سے دوری مستقل سوہانِ روح تھی۔ لیکن تعلیم جاری رکھنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنی رہائش دارالعلوم کے دارالطلبہ میں منتقل کرلی۔ اُس وقت دارالطلبہ کے دو بلاک تھے۔ ان میں سے مشرقی بلاک کے کنارے پر کمرہ نمبر ۱۶ میں ہمارا قیام ہوا۔ (یہ بلاک اب مدرسۃ البنات کا حصہ بن گیا ہے) اس کمرے کے بعد ایک کمرہ چھوڑ کر گنبد کے نیچے ایک بڑا کمرہ تھا۔ گنبد والے کمرے مجرد اساتذہ کو دیئے جاتے تھے۔ اور اس کمرے میں حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے جو اُس وقت نوجوان تھے، اور تازہ تازہ فارغ التحصیل ہوکر انہوں نے تدریس کا آغاز کیا تھا۔ چند دن ہمارا حسامی کا سبق بھی ان کے پاس ہوا تھا، اس لئے وہ ہمارے استاذ تھے، لیکن بڑے خوش مزاج اور خوش ذوق تھے، اور انہوں نے ہمیں اپنے آپ سے اتنا بے تکلف بنالیا تھا کہ وہ استاذ کم، اور دوست زیادہ بن گئے تھے۔

ہم پہلی بار گھر سے الگ ہو کر شرافی گوٹھ کی اس نئی عمارت میں منتقل ہوئے تھے۔ اُس وقت عمارت کے دو بلاک تو رنگ وروغن کے ساتھ مکمل ہو چکے تھے۔ اُن میں سے ایک جنوب میں واقع تھا، جو پندرہ کمروں پر مشتمل طلبہ کا دارالاقامہ تھا، اور دوسرا اُس کے مدمقابل شمال میں واقع تھا (جہاں اب نئی مسجد کا باب فاطمہ واقع ہے) اور وہ شروع میں بارہ درسگاہوں پر مشتمل تھا، بعد میں دو گول کمرے بن جانے کے بعد کل چودہ درسگاہیں ہو گئی تھیں۔

دونوں بلاکوں کے درمیان تقریباً سو گز کا فاصلہ تھا، جو تمام تر ریت کے ٹیلوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا، اور یہ ریت کے ٹیلے اور جھاڑیاں سانپ بچھو کے علاوہ گرگٹ، گوہ، سانڈے، سیہی اور نہ جانے کتنی مزید قسموں کے حشرات الارض کا مسکن تھے، جو دن کے وقت ہم سے ڈرتے تھے، اور رات کے وقت ہم اُن سے ڈرا کرتے تھے، کیونکہ یہی ان کی سیر وتفریح کا وقت ہوتا تھا، اور خاص طور پر بچھو عشاء کی نماز کے وقت آزادی سے گھومتے، اور شاید دن بھر کا بدلہ لینے کا بہترین موقع جان کر کسی نہ کسی کے پاؤں پر ڈس لیا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد بکثرت کسی نہ کسی طالب علم کے چیخنے کی آواز آتی، اور معلوم ہوتا کہ اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ آس پاس نہ کوئی ڈاکٹر تھا، نہ ہسپتال۔ لہٰذا علاج کے مختلف دیسی طریقے آزمائے جاتے تھے۔ کسی نے بتایا کہ اگر کوئی بچھو مار کر اسے تیل میں ڈال دیا جائے، تو اُس تیل سے بچھو کے ڈسنے کا علاج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ علاج کئی طلبہ پر آزمایا گیا، اور کچھ مفید بھی ثابت ہوا۔ آخر میں جو علاج سب سے زیادہ مقبول ہوا، وہ یہ تھا کہ جس جگہ بچھو نے کاٹا ہو، اُس جگہ کسی بچے سے دھار کے ساتھ پیشاب کروایا جائے۔ چنانچہ جب کسی کو بچھو کاٹتا، تو کسی بچے کو پکڑ کر اُسے پیشاب کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

جنوبی بلاک کے مشرقی کنارے کے بعد تھوڑی سی جگہ راستے کیلئے چھوڑ کر ایک تیسرا بلاک اُس وقت زیر تعمیر تھا جس پر ابھی رنگ وروغن نہیں ہوا تھا۔ اس بلاک کے مغربی کنارے پر کمرہ نمبر ۱۶ تھا جو ہمیں ٹھہرنے کیلئے دیا گیا۔ اس میں ہم دونوں بھائی اور ہمارے بھانجے حکیم مشرف حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے، اور اُس میں تین چھوٹی چھوٹی چارپائیاں ہم نے لاکر ڈال دی تھیں۔ سرکاری پانی کے نل وہاں تک نہیں پہنچے تھے، اور خود دارالعلوم کی زمین میں جو قدیم کنواں تھا، اُس کا پانی کھارا تھا جو پینے کے لائق نہیں تھا۔ لہٰذا ہمارے روزمرہ کے استعمال کیلئے پانی شرافی گوٹھ کے ایک کنویں سے آتا تھا جو تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع

تھا۔ وہاں سے پانی لانے کیلئے ایک گدھا گاڑی خرید لی گئی تھی جس پر ایک بڑے ٹینک میں پانی بھر کر لانے کی خدمت ایک خوش طبع جوان کے سپرد تھی جسے ہم موسیٰ بہشتی کہا کرتے تھے۔ وہ دن میں دو تین مرتبہ وہاں سے پانی بھر کر لاتا، اور دارالاقامہ کے درمیان کھڑے ہو کر زور سے آواز لگاتا: "پانی!" بلکہ اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اس کی آواز "پانڑی" سنائی دیتی تھی۔ اور یہ آواز سنکر ہم اپنے گھڑے اور صراحیاں اُٹھا کر گدھا گاڑی کے پاس پہنچ جاتے، اور موسیٰ بہشتی باری باری ہمارے برتنوں میں پانی بھر کر دیدیتا تھا۔

یہ پانی بھی اگرچہ پورا میٹھا نہیں تھا، لیکن پینے کے لائق ہوتا تھا۔ پینے کیلئے پانی صراحی میں اور وضو وغیرہ کیلئے گھڑے میں بھر لیا جاتا تھا، اور اُس سے لوٹے میں نکال کر وضو ہوتا تھا۔ بعد میں ہمیں کچھ تعیش سوجھا، تو پانی کی ایک چھوٹی سی ٹنکی لا کر اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں رکھ لی تھی جس کے نل سے وضو کرنے اور ہاتھ وغیرہ دھونے میں آسانی ہوگئی تھی۔ لیکن کبھی پانی ختم ہو جاتا، تو اُس کا فوری مداوا اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ جبتک موسیٰ بہشتی کی گاڑی کا وقت نہ ہو جائے، خود مدرسے کے کنویں سے کھارا پانی بھر کر لائیں، اور اُسی کو غنیمت سمجھیں۔ اُس وقت اس گدھا گاڑی کی قدر بھی معلوم ہوتی تھی۔

گدھا گاڑی کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر کوئی وی آئی پی مہمان بس کے ذریعے دارالعلوم آرہا ہوتا، تو اُسے لانڈھی سے دارالعلوم تک پیدل چلنے کی زحمت سے بچانے کے لئے گدھا گاڑی لانڈھی کے بس اسٹاپ پر بھیج دی جاتی تھی، اور وہ اس وی آئی پی گاڑی میں سوار ہو کر دارالعلوم پہنچ جاتا تھا۔ یہ شاہانہ سفر بیماروں کو بھی نصیب ہو جاتا تھا۔

اس دور افتادہ علاقے میں بجلی کے باقاعدہ کنکشن کا تو سوال ہی نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ حضرت مولانا نور احمد صاحب پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، انہوں نے شروع میں کہیں سے ایک چھوٹے سے جنریٹر کا انتظام کر کے وہاں نصب کر دیا تھا۔ وہ کچھ ایسا جنریٹر تھا کہ جب چلتا، تو جہاں جہاں بلب تھے، اُن میں روشنی جھپک جھپک کر آتی تھی، یعنی روشنی کے ہر لمحے کبھی کم کبھی زیادہ ہونے کا سلسلہ مستقل جاری رہتا تھا، البتہ آواز کی یکسانیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس ویرانے میں یہ جنریٹر بہت غنیمت معلوم ہوتا تھا، اور اُس کی صحیح قدر اُس وقت معلوم ہوئی جب چند ہی ہفتوں کے بعد وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ناقابل علاج ہوگیا، اور اب یہ ویرانہ اپنی فطری حالت پر لوٹ گیا۔

ہم نے ایک لالٹین اپنے کمرے میں رکھی ہوئی تھی جس کیلئے مٹی کا تیل لائن لگا کر ملا کرتا تھا، اور اُس کی چمنی کی صفائی اور اُس میں پرانی بتی کے جل جانے کے بعد نئی بتی ڈالنے کی خدمت میرے سپرد تھی، اور اسی لالٹین کے اردگرد بیٹھ کر ہم مطالعہ کیا کرتے، اور جب میری اور بھائی صاحب کی تکرار کی جماعتیں الگ ہوگئیں، تو ہم نے ایک اور لالٹین لے لی، اور ہم اپنی اپنی لالٹین درسگاہ میں لیجا کر وہاں تکرار کیا کرتے۔ البتہ مسجد میں ایک گیس کا ہنڈا جلایا جاتا تھا جس کے اردگرد طلبہ بیٹھ جاتے، اور تکرار اور مطالعے کی ضرورت اجتماعی طور پر پوری کرتے تھے۔

صبح کو ناشتے میں طلبہ کو مطبخ سے ایک روٹی ملتی تھی، اور چائے یا دودھ خود گرم کرنا ہوتا تھا۔ ہم نے چائے کی عادت چھوڑ دی تھی، اور اُس کے بجائے روٹی دودھ سے کھالیتے تھے۔ دودھ بھی بھینس کا دستیاب نہ تھا۔ گائے کا دودھ ایک کیلومیٹر دور گوٹھ سے لانا پڑتا تھا۔ گوٹھ سے دودھ لانے کی خدمت میں یا حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے ذائقے سے منہ کو مانوس کرنے کیلئے کافی عرصہ لگا۔ ناشتے میں اور دوپہر یا رات کے کھانے کے وقت اُسے گرم کرنے کے لئے ایک پرانا سا مٹی کے تیل کا اسٹوو رکھا ہوا تھا جس کا آگ پکڑنے والا حصہ بار بار ناکارہ ہوجاتا تھا، اور اُسے گرم کرنے کیلئے خاصی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔

مدرسے کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اُس کے مغرب میں میلوں تک ریگستان تھا، اور اُس سمت میں سمندر تک نہ کوئی آبادی تھی، نہ کوئی عمارت، نہ کوئی درخت۔ ریت کے ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں کچھ خودرو جھاڑیاں ضرور تھیں، مگر وہ بھی ریت سے اٹی ہوئی۔ چونکہ مدرسے میں ہوا کا رخ مغرب ہی کی طرف سے تھا، اس لئے وہاں سے آنے والی ہوا عام حالات میں بھی ریت کے ذرات ساتھ لایا کرتی تھی، لیکن گرمی میں بعض اوقات ریت کا طوفان چلا کرتا تھا جو کئی کئی دن جاری رہتا تھا، اور اُس میں ایک گز کے بعد کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، اور کمرے کی ہر چیز یہاں تک کہ بستر پر بھی ریت کی موٹی تہہ جم جاتی تھی۔

جنوب کی طرف بھی تقریباً ایک میل تک صحرا ہی تھا، لیکن اُس میں کہیں کہیں جنگلی درختوں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ اور ایک میل کے جنگل کے بعد لانڈھی کالونی نمبر ۶ کی بستی شروع ہوتی تھی، جو اُس وقت نئی نئی آباد ہورہی تھی۔

لیکن مدرسے کے مشرق میں کچھ دور چلنے کے بعد کھجوروں کا ایک باغ تھا، اور اُس کے بعد بھی دور تک

کئی باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ شمال میں بھی کچھ دور تک صحرا طے کرنے کے بعد کھیت اور باغات شروع ہو جاتے تھے، اور شمال مشرق میں وہ گاؤں تھا جو شرافی گوٹھ کہلاتا ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے چھپر نما ہوٹل سے شروع ہوتا تھا، جو اپنے مالک کے نام پر "شیدل" کا ہوٹل کہلاتا تھا۔ اور اُس کے بعد کچھ مکانات تھے جن کے درمیان وہ کنواں تھا جہاں سے ہمارے لئے پانی آتا تھا۔

شہر سے دارالعلوم آنے کے لئے عام طریقہ تو یہ تھا کہ لی مارکیٹ سے ایک بس نمبر ۴۷ چلا کرتی تھی جو ڈرگ روڈ اور ملیر سے ہوتی ہوئی لانڈھی آتی، اور پوری لانڈھی کالونی طے کرنے کے بعد لانڈھی ۶ نمبر اتارتی تھی۔ یہ بس لسبیلہ ہاؤس سے بھی گذرتی تھی، لیکن مختلف اسٹاپوں پر رکتی ہوئی آخر میں وہ ملیر پر بہت دیر رکتی تھی۔ اس لئے اُس کے ذریعے سفر کرنے میں دو سے تین گھنٹے لانڈھی چھ نمبر پہنچنے میں لگ جاتے تھے۔ پھر وہاں سے ہمارا تقریباً ڈیڑھ میل کا پیدل سفر شروع ہوتا تھا جس میں ہمیں دارالعلوم کے جنوبی جنگل سے گذرنا ہوتا تھا۔ البتہ اس طرح مدرسے تک پہنچنے میں تین سے چار گھنٹے لگ جانا معمولی بات تھی۔ اور جنگل سے گذرتے ہوئے اگر بارش آجاتی، تو اُس سے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اس جنگل سے گذرتے ہوئے جو بارش آئی، تو ہم سر سے پاؤں تک شرابور ہوگئے، اور نہ صرف پہنے ہوئے کپڑے بری طرح بھیگ گئے، بلکہ تھیلے میں جو کپڑے ہفتے کے دوران پہننے کے لئے لائے تھے، وہ بھی تربتر ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا شمس الحق صاحب پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، انہوں نے ہمیں اپنے گنبد والے کمرے کی عقبی کھڑکی سے اس طرح بھیگتے ہوئے آتے دیکھا، تو اپنے کمرے میں بلایا، اور عارضی طور پر خشک کپڑوں کا انتظام کیا۔

شرافی گوٹھ آنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ دن میں دو مرتبہ ایک بس نمبر ۵۲ لی مارکیٹ سے چلتی تھی، اور وہ کالے پل اور کورنگی روڈ سے ہوتی ہوئی چکرا گوٹھ (جہاں آجکل کورنگی نمبر ۱ر واقع ہے) جاتی، اور وہاں سے کچی سڑک کے ذریعے عین شرافی گوٹھ میں لے جاکر اتارتی تھی۔ اگر کبھی یہ بس مل جائے تو یہ ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی، کیونکہ اس میں وقت بھی کم لگتا تھا، اور پیدل بھی کم چلنا پڑتا تھا، لیکن اس میں سوار ہونے کیلئے ایک مقررہ وقت پر لی مارکیٹ پہنچنا ضروری تھا۔ اگر لی مارکیٹ پہنچنے کا نشانہ صحیح نہ بیٹھے، تو یہ بس نکل جاتی تھی، اور پھر وہی ۴۷ر نمبر والی بس لازمی ہو جاتی تھی، اور سفر اور زیادہ لمبا ہو جاتا تھا۔

دارالعلوم پہنچنے کے بعد ہمارا رابطہ پورے شہر سے بالکل کٹ جاتا تھا، کیونکہ ٹیلی فون دور دور نہیں تھا۔

ابھی ہمیں یہاں آئے ہوئے دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ حکیم مشرف حسین صاحبؒ انفلوئنزا کا شکار ہو گئے۔ بخار اتنا تیز تھا کہ حواس قابو میں نہ تھے۔ قریب میں کوئی قابلِ اعتبار علاج میسر نہ تھا۔ اسلئے رائے ہوئی کہ گھر والوں کو اطلاع کر کے انہیں گھر بھیج دیا جائے۔ لیکن گھر اطلاع کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ آخر بھائی صاحب (حضرت مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم) نے ایک سائیکل مستعار لی، مجھے پیچھے بٹھایا، اور جنگلوں سے ہوتے ہوئے بابر مارکیٹ کے قریب ایک تھانے سے جا کر گھر فون کیا، اور وہاں سے گاڑی منگوا کر انہیں گھر بھیجا گیا۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ ہم سے ایک سال آگے کی جماعت میں تھے، اور اس سال انہیں دورۂ حدیث کی جماعت میں شامل ہونا چاہئے تھا، لیکن حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اُس وقت سے یہاں بھیج دیا تھا جب یہاں ایک چوکی دار اور بکریوں کے سوا کوئی اور نہیں رہتا تھا۔ پھر اُن کے ذمے ہر قسم کے انتظامی کام سونپ دیئے تھے، اور ان کی شادی بھی ایک برمی خاتون سے کرادی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں میاں بیوی کو اپنے فضلِ خاص سے نوازیں، انہوں نے دارالعلوم کے اس انتہائی مشکل دور میں پورے دارالعلوم کی ایسی خدمات اپنے سر لے رکھی تھیں جو ایک گھر کی گھرہستن ہی انجام دے سکتی ہے۔ تعمیرات کی نگرانی سے لے کر دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ کی ہر قسم کی ضروریات وہی پوری کرتے تھے۔ جب کسی شخص کو کوئی مسئلہ پیش آتا، وہ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ ہی کا رُخ کرتا تھا۔ اُن کا واحد معاون ایک چوکی دار تھا جس کا نام عبدالعزیز تو بہت عرصے بعد پتہ چلا، لیکن سب اُس کو "لالہ" کہا کرتے تھے۔ وہ بڑا خوش مزاج پٹھان تھا، اور سارے طلبہ سے اُس کی دوستی تھی۔ وہ بہت تیز تیز بولنے کا عادی تھا، لیکن دارالعلوم کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ایسی رکھوالی کرتا تھا جیسے گھر کی کوئی مالکہ اپنے گھر کی رکھوالی کرتی ہے۔

جب ہم شروع شروع میں یہاں آئے، تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کو یہ احساس ہوا کہ ہم لوگ گھر کے کھانے کے عادی ہیں، اور مطبخ کا کھانا ہم سے شاید نہیں چل سکے گا، اس لئے انہوں نے اپنی اہلیہ کی مرضی لے کر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ پیشکش کی کہ ان کا کھانا ہمارے گھر میں پکا کرے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ پیشکش اس شرط کے ساتھ منظور فرمائی، کہ اُس کے اخراجات وہ ادا کیا کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان دونوں میاں بیوی کو بہترین جزا عطا فرمائیں، کچھ عرصے تک ہمارا کھانا اُن کے گھر سے آتا رہا۔

لیکن ان کے اخلاص کے باوجود مستقل طور پر اُن سے یہ خدمت لینے کا طبیعتوں پر ایک بار سا تھا، اس لئے کچھ عرصے کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سلسلہ موقوف فرمادیا، اور فرمایا کہ: ''الحمدللہ مجھے یہ استطاعت ہے کہ تمہارے لئے الگ باورچی رکھ کر تمہارا کھانا الگ بنوادیا کروں، لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ جو کھانا عام طلبہ کھاتے ہیں، وہی تم بھی کھاؤ، تاکہ طالب علمی کا صحیح ذائقہ اور اُس کی برکات تمہیں حاصل ہوں''۔ ہم نے بخوشی یہ تبدیلی منظور کرلی، اور ہم مطبخ سے قیمت دیکر کھانا لینے لگے۔

اُس وقت مطبخ دارالعلوم کے جنوب مشرق میں ایک گیرج نما کمرہ تھا جس کا دروازہ کوئی نہیں تھا، اور اوپر ٹین کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے شمال میں ایک تنور تھا، اور اُسی کے برابر ایک یا دو چولھے تھے جن میں لکڑیاں یا کوئلے جلتے تھے، اور اُن کے ذریعے سالن پکتا تھا۔ روزانہ کا مینیو (menue) یہ تھا کہ ہر روز دوپہر کو چنے کی دال اور شام کو پانی کی طرح پتلا شوربا پکا کرتا تھا، لیکن محمود باورچی کی کاریگری یہ تھی کہ اُسی پتلے سے شوربے میں ایسی سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی کہ وہ آج بھی یاد آتی ہے۔ چونکہ مطبخ کا دروازہ کوئی نہیں تھا، اس لئے روٹی ہو، یا دال، یا شوربا، بکثرت اُن میں سامنے اُڑتی ہوئی ریت کی کچھ نہ کچھ ملاوٹ ہو ہی جایا کرتی تھی۔ مطبخ کے ناظم جناب مولانا مجیب الرحمٰن صاحب مومن شاہی مدظلہم تھے جو آجکل ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دونوں جہان میں سرخ روئی عطا فرمائیں، وہ بڑی کفایت شعاری سے مطبخ کا انتظام چلایا کرتے تھے، اور اُس وقت جبکہ اس دور افتادہ صحرا میں اشیائے ضرورت کی فراہمی بڑا مشکل کام تھا، بڑی تن دہی سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ نہ ریت بردار ہواؤں پر ان کا قابو تھا، اور نہ وہ بجٹ سے باہر جاکر کھانا بنواسکتے تھے۔

ہماری والدہ صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ ہر ہفتے کچھ گھی ہمیں بھیج دیا کرتی تھیں۔ اُس کا فائدہ یہ تھا کہ ہم ناشتے میں روٹی اُس سے تل لیتے تھے، اور جب تک وہ گھی باقی رہتا، دوپہر کو چنے کی دال میں گھی ڈالکر کھاتے۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اُس وقت نوجوان تھے، اور ہمارے کمرے کے برابر ہی رہتے تھے، انہوں نے یہ ترکیب بتائی تھی کہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے انہیں گھی میں تل لیا کرو، اور اُنہیں دال میں ڈال کر دال کو گرم کرو، تو اُس کا مزہ دوگنا ہوجائے گا۔ چنانچہ جب کبھی اس کا موقع مل جاتا، تو وہ ہمارا اعلیٰ درجے کا کھانا ہوتا۔ اور کبھی مرچوں کے کھیت میں جانا ہوتا، تو مالک کی اجازت سے کچھ ہری

مرچیں توڑلاتے، اور دال میں اُس سے ذائقہ حاصل کرلیتے تھے۔

اپنے گھر میں شاہانہ زندگی گذارنے کے بعد اس ویرانے سے اپنے آپ کو مانوس کرنا اور شہر کے پُرتعیش ماحول سے کٹ کر جفاکشی کی دیہاتی فضا میں رہنا ہمارے لئے ایک مجاہدے سے کم نہ تھا۔ میری عمر اُس وقت چودہ سال کے قریب تھی، اور اس سے پہلے والدین اور بہن بھائیوں کے بھرے پُرے کنبے سے الگ رہنے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لئے شروع کے کچھ دن ایسے گذرے کہ میں چھپ چھپ کر رویا کرتا تھا۔ لیکن انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ جب وہ کوئی مشقت اٹھانے کا پکا ارادہ کرلے تو رفتہ رفتہ وہ اُس کی عادت بن جاتی ہے، اور مشقت میں بھی کمی آجاتی ہے۔ ہم پر یہ بات اچھی طرح واضح تھی کہ اپنی تعلیم کو بہتر بنانے کیلئے ہمیں ہر قیمت پر یہ مشقت برداشت کرنی ہے، اس لئے ذہن کو اس کے لئے پوری طرح تیار کرلیا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے آپ کو اس ماحول میں اس طرح مدغم کرلیا کہ اب اسی میں اپنی راحت اور لطف کے نئے راستے تلاش کرلئے۔ اور کم از کم اپنے بارے میں یہ بات میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس زمانے میں یہ تھوڑی سی مشقت نہ اُٹھائی ہوتی، تو جاہل تو میں آج بھی ہوں، لیکن اُس صورت میں آج سے کہیں زیادہ جاہل ہوتا۔

شروع کے چند مہینے تو ہم نے دارالطلبہ کے اُسی کمرہ نمبر ۱۶ میں گذارے۔ پھر دارالعلوم کے ایک معاون حاجی کبیر الدین صاحب مرحوم نے جو مشرقی پاکستان کے ایک تاجر تھے، دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر درسگاہوں کے قریب بنوا کر دارالعلوم کو دیدیا تھا، یہ مقصد بھی تھا کہ جب کبھی وہ کراچی آئیں، تو اُس میں ٹھہر سکیں۔ انہوں نے ہی ہمیں یہ پیشکش کی کہ ہم ان میں سے ایک کمرے میں منتقل ہوجائیں۔ چنانچہ ہم وہاں منتقل ہوگئے۔ یہ چھوٹا سا گھر دوسری تمام عمارتوں سے الگ تھلگ تھا۔ دن میں تو درسگاہوں کے قریب ہونے کی وجہ سے تنہائی کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا، لیکن رات کو اُس کے چاروں طرف شدید سناٹا چھا جاتا تھا۔ البتہ اُس کے شمالی جانب میں ایک کچی سڑک گذرتی تھی جس پر سے کبھی کبھی کوئی اونٹ گاڑی گذر جاتی، اور اونٹ کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز آجایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ خاص طور پر سردی کی راتوں میں گیدڑ ہمارے گھر کا محاصرہ کرلیتے، اور ان کے رونے کی آواز دیر تک آتی رہتی تھی۔ لیکن یہ گھر نسبۃً کشادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ آرام دہ بھی تھا، اور سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ کمروں کے باہر اُس میں ایک غسل خانہ بنا ہوا

تھا، اس لئے ہمیں مشترک غسل خانے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پھر جب ہمارے چچا زاد بھائی جناب مولانا خورشید عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے فارغ ہو کر یہاں استاذ بنے، تو اس گھر کا ایک کمرہ انہیں دیدیا گیا جو دن کے وقت اُن کی درسگاہ ہوتی، اور باقی اوقات میں انکا رہائشی کمرہ۔ اور دوسرے کمرے میں ہم دونوں بھائی اور مولانا حکیم مشرف حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے۔ یہ گھر چونکہ درس گاہوں کے قریب تھا، اس لئے متعدد اساتذہ بھی سبقوں کے درمیان دم لینے کیلئے کبھی کبھی وہاں تشریف لے آتے تھے۔

دیہاتی زندگی میں جہاں کچھ مشقتیں ہوتی ہیں، وہاں کچھ ایسے فوائد بھی ہوتے ہیں جو شہروں میں حاصل نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس وقت دار العلوم کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اُس کے مغرب میں تو سمندر تک لق و دق صحرا تھا، لیکن اُس کے مشرق میں ایک بہت بڑا اور گھنا نخلستان تھا، اور اُس کے بعد مختلف پھلوں کا بڑا خوبصورت باغ تھا جس میں چیکو، امرود اور لیموں وغیرہ کے درخت بڑے قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ یہ پیر بخش کا باغ کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ دار العلوم کے شمال میں تقریباً ایک کیلومیٹر کی حدود میں مرچوں اور مختلف ترکاریوں کے کھیت تھے جن کی پشت پر شرافی گوٹھ آباد تھا، اور گوٹھ کے ختم ہونے کے بعد بیلوں کی نسل کشی کے لئے ایک سرکاری فارم تھا جو اب بھی کیٹل فارم کہلاتا ہے۔ اس میں اعلیٰ نسل کے بیلوں کی پرورش اور نسل کشی بھی ہوتی تھی، اور بہت سے سائنسی تجربات بھی کئے جاتے تھے۔ اس کیٹل فارم کے پاس زمین کا بڑا وسیع رقبہ تھا جس میں کیٹل فارم کی طرف سے جنوب میں جانوروں کے چارے کے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے جو کئی میل تک چلے گئے تھے، اور اُس جگہ تک پھیلے ہوئے تھے جہاں آج شاہ فیصل کالونی آباد ہے۔ یہ قدرتی مناظر شہری زندگی میں میسر نہیں آسکتے تھے۔ چنانچہ دن بھر کی پڑھائی سے فارغ ہو کر عصر کی نماز کے بعد ہم ان مناظر کا طرح طرح سے مزہ لیتے تھے۔

میرے بھانجے حکیم مشرف حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر میں کئی بار کر چکا ہوں، وہ مجھ سے عمر میں دو سال بڑے تھے، لیکن میں ان کا ماموں تھا، اور پڑھائی میں اُن سے ایک سال آگے۔ اس طرح ہمارے درمیان عمر اور رشتے کا مقاصہ (set.off) ہو گیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ میرے واحد دوست تھے جو بچپن سے کھیل کود اور تفریح سے لیکر مدرسے کی زندگی تک ہر چیز میں ساتھ تھے۔ چنانچہ عصر کے بعد ہم دونوں مدرسے

سے نکل کر پہلے گوٹھ جاتے، جہاں ایک چھپر نما ریسٹورنٹ تھا جو اپنے مالک "شیدل" کے نام پر "شیدل کا ہوٹل" کہلاتا تھا۔ عصر کے بعد وہاں ہم دونوں چائے پیتے اور پھر کھیتوں اور باغوں میں نکل جاتے۔ یہاں کے باغات میں امرود بڑا خوشبودار اور لذیذ ہوتا تھا، اور باغ والے ہمیں آٹھ آنے فی سیر کے حساب سے اپنے ہاتھوں سے امرود توڑ کر کھانے کی اجازت دیدیتے تھے۔ یہ لذت شہر میں کہاں میسر آسکتی تھی؟ عصر کے بعد کا وقت ان سبزہ زاروں میں گذارنے کے بعد ہم اپنے مدرسے میں واپس آتے، لالٹین جلاتے، اور اُس کی روشنی میں عشاء تک کل کے اسباق کا مطالعہ اس طرح کرتے کہ اُس میں کوئی مخل نہیں ہوتا تھا۔ عشاء کے بعد مطبخ سے خریدا ہوا کھانا ایک اسٹوو کی مدد سے گرم کرتے، یہ عموماً ایک پتلا سا شوربا ہوتا تھا جس کے پانی کی طرح پتلا ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ اگر کپڑے پر گرجائے (جو مجھ سے بکثرت گرجاتا تھا)، تو اُس کے دھبے کو دھونے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ بھوک کے عالم میں یہ شوربا عصر سے پہلے کے پکے ہوئے تنوری نان کے ساتھ کھانے میں اب لذت آنے لگی تھی۔ پھر فوراً ہی ہمارے تکرار کا وقت ہوجاتا، جو لالٹین کی روشنی میں رات گئے تک جاری رہتا۔

ہم جب شروع میں یہاں آئے، تو ہم جماعت طلبہ نے "والی بال" کی ایک ٹیم بنالی تھی جس میں عصر کے بعد طلبہ کے ساتھ حضرت مولانا شمس الحق صاحب اور حضرت مولانا خورشید عالم صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ والی بال کے بجائے "بنوٹ" کا کھیل کھیلا کرو تو میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوجاؤں گا۔

"بنوٹ" ایک لاٹھی کا کھیل ہوتا تھا جس میں لاٹھی چلانے اور لاٹھی سے دشمن کا مقابلہ کرنے کے بڑے زبردست ہنر کا مظاہرہ کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی شخص "بنوٹ" کا ماہر ہو، اور لاٹھی چلانے کا ہنر جانتا ہو تو وہ تنہا بڑے سے بڑے مجمع سے نمٹ سکتا تھا۔ یہ کھیل دارالعلوم دیوبند میں بھی سکھایا جاتا تھا، اور اُس کے باقاعدہ استاد مقرر تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ ہنر وہیں سیکھا تھا، اور میرے چاروں بڑے بھائی بھی اس کی مشق دیوبند ہی سے کیا کرتے تھے، اور ہمارے بھائی جان جناب محمد زکی کیفی صاحبؒ تو اس کے اچھے خاصے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرتؒ کی تحریک پر کچھ عرصے ہم نے عصر کے بعد بنوٹ کی بھی مشق کی۔

پھر نانک واڑہ میں رہتے ہوئے شہری دفاع اور ابتدائی طبی امداد کی جو تربیت ہم نے حاصل کی تھی، اُس کی

وجہ سے ہمیں یہ شوق بھی تھا کہ باقاعدہ عسکری تربیت بھی حاصل کریں۔ ہم نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی تو حضرتؒ نے ایک ریٹائرڈ فوجی انسٹرکٹر کی خدمات حاصل کرلیں، اور میری یادداشتوں کے مطابق ۱۰؍ اگست ۱۹۵۸ء سے عصر کے بعد ان کی تربیت کا سلسلہ شروع ہوگیا جس میں انہوں نے شروع میں ہمیں پریڈ سکھائی، پھر دشمن پر قابو پانے کے مختلف طریقوں کی عملی مشق کرائی۔ عمارتوں اور دیواروں پر چڑھنے، اور پھر زخمیوں کو کندھے پر سوار کرکے چڑھنے کے طریقے سکھائے۔ آخر میں مصنوعی بندوقوں کے ذریعے بندوقوں کے استعمال کی بھی مشق کرائی، لیکن یہ تربیت کچھ عرصے ہی جاری رہی، اور اس کے بعد اس کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

اُس سال ہمیں ملاحسن، تصریح اور سراجی حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ کے پاس پڑھنی تھی ہدایہ اخیرین اور میبذی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم کے پاس اور توضیح حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، شرح عقائد اور حصون حمیدیہ حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اور دیوان حماسہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس۔

یہ تمام اساتذۂ کرام ماشاء اللہ اپنے علم وفضل اور دلنشین طرز تدریس کے اعتبار سے ایسے تھے کہ ایک سے ایک بڑھکر تھا۔ اور ان تمام حضرات کے درس ایسے تھے کہ ان کی دلکشی نے اس صحرا کی جفاکش زندگی کو بھی حسین بنادیا تھا۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ میں نقوش رفتگاں میں کرچکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ اُس سال ہمارے تین درس اُن کے پاس تھے۔ ایک ملاحسن، دوسرے سراجی اور تیسرے تصریح۔

میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ منطق میں شرح تہذیب کے بعد کی کتابوں سے مجھے کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن حضرتؒ کا انداز تدریس ایسا تھا کہ اُس میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس سے پہلے مجھے منطق کی کتاب کا پیشگی مطالعہ کرنے کی عادت نہیں تھی، لیکن ملاحسن کا میں مطالعہ کرکے جاتا، اور سبق بھی دلچسپی سے پڑھتا اور اُس کا تکرار بھی کراتا تھا۔ اس طرح منطق میں مجھے اپنی جو کمزوری محسوس ہوتی تھی، وہ بڑی حد تک دور ہوئی۔

دوسری کتاب سراجی تھی جو علم میراث کی مشہور کتاب ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے میراث پر خود ایک

مستقل کتاب "تسہیل المیراث" کے نام سے لکھی تھی جس میں میراث کے مسائل آسان انداز میں بیان فرمائے تھے، نیز انہوں نے میراث کے حصے نکالنے کا ایسا طریقہ بھی حساب کی بنیاد پر تجویز کیا تھا جو حصے نکالنے کے قدیم طریقے سے مختلف تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سراجی پڑھانے کے بجائے "تسہیل المیراث" کی بنیاد پر علم میراث کی تعلیم دی، اور اُس کی خوب مشق کرائی، یہاں تک کہ ہم مناسخے کے طویل طویل مسائل آسانی سے حل کرنے لگے تھے۔ بعد میں سراجی پڑھنا ہمارے لئے آسان ہوگیا۔

تیسرا اہم سبق حضرتؒ کے پاس تصریح کا تھا۔ حضرتؒ کو فقہ کے ساتھ فلکیات اور ریاضی میں خصوصی مہارت حاصل تھی، چنانچہ تصریح کے درس میں حضرتؒ کی اس مہارت سے خوب خوب استفادہ ہوا۔ پھر حضرتؒ نے خود اپنی طرف سے ہمیں "خلاصۃ الحساب" کا بھی ایک حصہ پڑھایا، اور اسطرلاب اور اربعہ مجیبہ اور اربعہ مقنطرہ کے استعمال کا طریقہ بھی سمجھایا۔ (یہ سب فلکیات اور جغرافیہ میں پیائش کے قدیم آلات تھے۔) تصریح میں تو بطلیموسی فلکیات کا بیان ہے جس کی تشریح حضرتؒ ایک کُرے کی مدد سے فرماتے تھے، لیکن اُس کے ساتھ ساتھ فلکیات کے بارے میں جدید فیثاغورسی نظریات اور معلومات سے بھی مستفید فرماتے تھے۔

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت عہد شباب میں تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور میرے شیخ ثانی حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ کے مدرسے مفتاح العلوم جلال آباد میں طویل عرصے تدریس کی خدمات انجام دیکر مستقل سکونت کی غرض سے پاکستان تشریف لائے تھے۔ اگرچہ اُس سال ہدایہ اخیرین اور میبذی، ہماری دو کتابیں، حضرت کے پاس تھیں، لیکن جہاں تک یاد ہے، اسباق دن میں اجتماعی طور پر شروع ہوئے، اور شام کو اُن کے پاس میبذی کا گھنٹہ تھا، اس لئے اُن سے ہم نے پہلا سبق میبذی کا پڑھا تھا۔ مجھے طبعی طور پر منطق اور فلسفے سےکوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، بس ضرورۃً ہی منطق کی کتابیں پڑھتا آیا تھا، البتہ فلسفے کی یہ پہلی اور آخری کتاب تھی۔ لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ دونوں جہانوں میں اپنے فضل خاص سے نوازیں، انہوں نے پہلا سبق ہی اس شان سے پڑھایا کہ کتاب اور استاذ دونوں سے حد درجہ مناسبت پیدا ہوگئی، اور اپنے سابق طرزِ عمل کے برعکس پورے سال میں نے میبذی بڑی محنت اور ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی۔ اُن

کے پاس دوسرا سبق ہدایہ اخیرین کا تھا۔ وہ بھی ماشاء اللہ خوب ہوا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایہ اخیرین حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی، اس لئے انہیں درس میں اپنے شیخؒ کی اتباع کا بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ صبح کے پہلے گھنٹے میں وہ ہمیشہ وقت پر درس کیلئے تشریف لاتے، اور دو گھنٹے مسلسل درس دیتے ہوئے اپنے شگفتہ چہرے اور دلکش انداز گفتگو سے ہمیں اس طرح نہال کر دیتے تھے کہ تھکن کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

اس سال ہمارے تیسرے استاذ حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ مظاہر علوم سہارنپور کے نہایت قابل اور مقبول استاذ تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے منظور نظر، اور حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں کے حاضر باش۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے پاکستان آنے کا ارادہ کر کے دارالعلوم میں تدریس کے فرائض انجام دینے کو قبول فرمالیا تھا۔ اُن کی تدریس کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ مشکل سے مشکل مباحث کو اس طرح پانی کر کے سمجھا دیتے تھے کہ طالب علم کے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ ان کی تقریر ایسی مربوط اور دلنشین ہوتی تھی کہ اگر اُس کو لفظ بہ لفظ قلم بند کرلیا جاتا، تو الفاظ کو زیادہ آگے پیچھے کئے بغیر وہ ایک شگفتہ تحریر کی صورت میں شائع کی جاسکتی تھی۔ اُس سال ہماری اصول فقہ کی کتاب "توضیح" اُن کے سپرد تھی، اور انہوں نے یہ کتاب ہمیں اس طرح آسان کر کے پڑھائی کہ ہمیں یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ یہ کوئی مشکل کتاب ہے۔ آئندہ جب "توضیح" خود پڑھانے کی نوبت آئی تو اندازہ ہوا کہ کتاب اتنی آسان نہیں ہے جتنی ہم پڑھنے کے زمانے میں سمجھتے تھے۔ رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعة.

اُس سال ہماری خوش قسمتی سے دارالعلوم کے اساتذہ میں ایک بیش قیمت اضافہ اور ہوا۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جیکب لائن میں "ادارۂ شرقیہ" کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے تھے جس میں مشرقی زبانوں (عربی، فارسی اور اردو) کے امتحانات (فاضل عربی، فاضل فارسی، فاضل اردو وغیرہ) کی تیاری کرائی جاتی تھی۔ لیکن ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی درس نظامی کے مدرسے میں تدریس کی خدمت انجام دیں۔ اس سال انہوں نے دارالعلوم میں کچھ اسباق بلا معاوضہ پڑھانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اُس زمانے میں شہر سے دارالعلوم کی نئی عمارت میں آنا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا، لیکن حضرتؒ نے بڑی قربانی دی کہ روزانہ شہر سے دارالعلوم اس طرح تشریف لاتے تھے کہ لانڈھی کے

بس اسٹاپ پر اتر کر تقریباً ایک میل پیدل آنا پڑتا تھا۔ وہ چائے اور پان کے بلانوشی کی حد تک عادی تھے، اوراس وقت اس ویرانے میں ان چیزوں کا انتظام مشکل تھا، اس لئے ان دونوں چیزوں کا ذخیرہ وہ اپنے ساتھ ہی لایا کرتے تھے۔ اُس سال ہماری ایک کتاب "دیوان حماسہ" ان کے پاس تھی۔ اور انہوں نے یہ کتاب جس اہتمام سے پڑھائی، وہ ہماری طالب علمانہ زندگی کی نہایت خوشگوار یاد ہے۔ وہ حماسہ کے اشعار کی تشریح اس طرح فرماتے تھے کہ نہ صرف عربی محاورات اور ضرب الامثال کی بہترین وضاحت ہوجاتی تھی، بلکہ زمانۂ جاہلیت اور ابتدائے اسلام کے عہد کا پورا قبائلی اور ثقافتی منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔

اُس سال تکرار کا نظم کچھ اس طرح ہوگیا کہ تکرار کی بڑی جماعت بنانے کے بجائے دو دو طالب علموں کی ٹولیاں بنگئی تھیں۔ ہمارے ہم سبق ساتھیوں میں برما کے دوساتھیوں سے ہمیں خاص مناسبت اس لئے ہوگئی تھی کہ وہ مچھلی بڑی لذیذ پکاتے تھے، انہوں نے ایک دو مرتبہ خود ہماری دعوت کی تھی، وہ اس قدر پسند آئی کہ بعد میں جب زیادہ دن گذرجاتے، تو ہم خود اُن سے فرمائش کرکے دعوت کرواتے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا محب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور ایک مولانا مفتی عبداللہ صاحب مدظلہم (جو آج کل دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے استاد اور تخصص فی الافتاء کے نگراں ہیں) مولانا محب اللہ صاحبؒ میرے بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم کے حصے میں آئے، اور مفتی عبداللہ صاحب کو مجھ سے سابقہ پڑا۔ اُنہوں نے شاید میری رعایت سے مجھ سے فرمایا کہ تکرار تم کرایا کرو، میں نے بھی تکلف نہ کیا، اور میں عشاء کے بعد چھوٹی سی بھڑکتی پھڑکتی لالٹین لیکر درسگاہوں کے درمیان ایک زیرِ تعمیر گول کمرے کے کنارے چلا جاتا، مولانا بھی وہاں آجاتے، اور تمام کتابوں کا تکرار میں ہی کراتا تھا۔ برما کے ساتھیوں کا تجربہ ہمیشہ مجھے یہ رہا کہ ان میں سے جو طلبہ ذہین اور ذی استعداد ہوتے، وہ بلا کے ذہین اور قابل ہوتے تھے۔ مولانا مدظلہم میرے تکرار کو خاموشی سے سُنا کرتے تھے، اور تکرار کے دوران کبھی کچھ بولتے نہیں تھے، اس سے۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ یہ غلط فہمی ہوگئی کہ شاید مولانا کو سبق پر پورا قابو نہیں ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں میبذی کے سبق میں کسی وجہ سے پہنچ نہیں سکا۔ اُس دن "برہان سلّمی" کا سبق تھا جو خاصا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ میں نے سبق کے بعد اُسے مطالعے سے حل کرنے کی کوشش کی، تو وہ حل نہ ہوا۔ جب تکرار کا وقت آیا تو میں نے مولانا عبداللہ صاحب سے کہا کہ میں تو آج سبق میں آنہیں سکا، اور مطالعے سے یہ بحث مجھے اتنی سمجھ میں نہیں آئی کہ میں اُس کا تکرار کراسکوں،

لہٰذا آج اس سبق کا تکرار آپ کرائیں۔ مجھے ان کی خاموش طبعی اور اپنی مذکورہ بالا غلط فہمی کی وجہ سے خطرہ تھا کہ شاید وہ عذر کریں یا شرمائیں، لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ مولانا فوراً راضی ہوگئے، اور پھر جو انہوں نے تکرار کرایا تو اُس دن اُن کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔ انہوں نے اس اچھی خاصی مشکل بحث کو ایسے دلنشین انداز سے بیان فرمایا کہ جو مقامات میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے، وہ خوب سمجھ میں آگئے۔ ان کے تکرار کرانے سے مجھے جو خوشی ہوئی، وہ آج تک یاد ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں بعافیت سلامت رکھیں، اور ان کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائیں کہ اُن سے جو محبت اس تکرار کے زمانے میں قائم ہوئی تھی، وہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ اپنے علم کے علاوہ اپنے ذوق عبادت، زہد وتقویٰ اور عالی ہمتی کی وجہ سے میرے لئے ہمیشہ قابل رشک رہے۔ ان کی عالی ہمتی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے عین دورۂ حدیث کے سال قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ اور اب بھی وہ دارالعلوم میں نہ صرف استاذ حدیث ہیں، بلکہ دارالافتاء کے محترم ترین رُفقاء میں سے ہیں۔ درجہ تخصص کی نگرانی انہی کے سپرد ہے۔

غرض اس طرح ہمارا یہ تعلیمی سال پورا ہوا۔ اور امتحان سالانہ میں میرے نتائج یہ تھے:

تصریح: ۵۰، حماسہ: ۵۰، میبذی: ۴۷، توضیح: ۵۰، ملاحسن: ۴۷، ہدایہ اخیرین: ۵۰
سراجی: ۴۹، حسامی: ۴۵۔

ماہنامہ البلاغ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنے دوست احباب، عزیز واقارب کے لئے البلاغ جاری کروایئے اور ہمارے ساتھ آپ بھی دین اسلام کی اشاعت وتبلیغ کرنے والوں کی صف میں شامل ہوجایئے۔ جَزَاكُمُ اللّٰهُ خَيْراً وَّاَحْسَنُ الْجَزَاءِ

(مزید معلومات کے لئے دفتر البلاغ سے رابطہ فرمایئے)

فون نمبر: 021-35123222، موبائل نمبر: 0322-2787230